# علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

(۱۰)

از سعید احمد اکبر آبادی

سلسلہ کے لئے دیکھئے برہان بابت مارچ ۱۹۷۳ء

ہندوؤں کے لئے ایک یونیورسٹی "بنارس ہندو یونیورسٹی" کے نام سے چار برس پیشتر یعنی ۱۹۱۶ء میں بن چکی تھی، اور اس کے لئے ایکٹ کا جو ڈھانچہ تیار کیا گیا تھا، ہندو مسلم کے فرق کی رعایت سے وہی ڈھانچہ تھا جو بعد میں مسلم یونیورسٹی کے لئے بنایا گیا۔ چنانچہ اسی ایکٹ اور اس کے ملحقہ قوانین وضوابط (Statutes and ordinances) میں اس امر کی صراحت تھی کہ علی گڑھ محمڈن کالج ہی یونیورسٹی کی شکل میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔ اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ تعلیم اور انتظام کے اعتبار سے جو اغراض ومقاصد کالج کے تھے وہی اغراض ومقاصد اب یونیورسٹی کے ہوں گے۔ چنانچہ یہاں جدید اور مغربی علوم وفنون کے ساتھ اسلامی علوم وفنون کی تعلیم کا بھی خاص اہتمام ہوگا۔ مسلمان طلباء کے لئے دینیات ایک لازمی مضمون ہوگا۔ انتظامی اعتبار سے یہ بات بہت اہم ہے کہ اسی میں اس بات کی بھی صراحت تھی کہ کورٹ یونیورسٹی کی سب سے بڑی اور مؤثر مجلس حاکمہ ہوگی، اور اس کا ممبر کوئی غیر مسلم نہ ہو سکے گا۔ وائس چانسلر براہ راست کورٹ کے سامنے جواب دہ ہوگا، اور یونیورسٹی کے عہدہ داروں کے علاوہ کورٹ میں جن جماعتوں کی نمائندگی لازمی قرار دی گئی وہ حسب ذیل تھے:

(۱) بانی ممبران یعنی یونیورسٹی فاؤنڈیشن کمیٹی کے ممبر جن کی تعداد ایکٹ کے نفاذ کے وقت ۱۲۴ تھی۔

(۲) لائف ممبر یعنی وہ لوگ جنھوں نے کالج کو ایک لاکھ روپیہ نقد یا اتنے ہی کی جائداد دی ہو۔

(۳) وہ افراد جو یونیورسٹی کی ایک لاکھ یا اس سے زیادہ کی امداد کرنے والی ریاستوں کے نمائندہ ہوں

(۴) علی گڑھ کے اولڈ بوائز۔

(۵) آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس۔

(۶) دس افراد جو وائس چانسلر کے نامزد کردہ ہوں۔

(۷) ۳۲ افراد کا انتخاب خود کورٹ کرے گی اور یہ افراد (۱) اسلامیہ کالجوں یا مسلم تعلیمی اداروں کے نمائندہ ہوں گے، ان کی تعداد ۹ ہوگی (۲) پندرہ افراد مختلف علوم وفنون کے ماہر ہوں گے (۳) ۹ افراد دینیات اور اسلامی علوم وفنون کے ماہر ہوں گے۔

کورٹ کے بعد اکزکٹو کونسل کا نمبر آتا ہے، اس کے لئے ممبروں کی تعداد تیس رکھی گئی تھی اور اس کی ہیئت ترکیبی یہ تھی۔

(۱) وائس چانسلر، پرو وائس چانسلر، ٹریژرر اور یونیورسٹی کے کسی کالج کا پرنسپل۔

(۲) چھ ممبر اکڈمک کونسل کے نامزد کردہ۔

(۳) باقی بیس ممبر کورٹ کے انتخاب کردہ ہوں گے۔

کورٹ اور اکزکٹو کونسل ان دونوں کی ہیئت ترکیبی پر غور کیجئے! صاف نظر آتا ہے کہ چونکہ یہ یونیورسٹی اصلاً و اساساً مسلمان طلباء کی تعلیم کے لئے قائم کی گئی تھی اور یہ اسلامی تہذیب و ثقافت کی نمائندہ تھی اور سرمایہ بھی مسلمانوں کا فراہم کیا ہوا تھا اس بنا پر حکومت وقت نے یہ تسلیم کر لیا کہ اس کا دروبست اور انتظام و انصرام بھی مسلمانوں کے ہاتھ میں رہنا

چاہیئے۔

ایک سوال اور اس کا جواب | اب یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا انگریز اس طرح ہندوؤں اور مسلمانوں کی الگ الگ دو خود مختار (Autonomous) یونیورسٹیاں قائم کر کے ملک کے دو بہت بڑے فرقوں میں باہم کشیدگی اور فرقہ پرستی پیدا کرنا چاہتے تھے؟ آج کل کے بہت سے مدعیان قوم پرستی تو اس سوال کا جواب اثبات میں ہی دیں گے اور استدلال میں کہیں گے کہ "چنانچہ دیکھ لیجئے! ہندو بنارس یونیورسٹی ہندو مہا سبھا اور راشٹریہ سیوک سنگھ کا اور مسلم یونیورسٹی علی گڑھ مسلم لیگ کی تحریک پاکستان کا مرکز بن گئیں اور اس طرح انگریز کی ہندی سیاست جو "پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو" کے اصول پر قائم تھی کامیاب رہی۔

لیکن درحقیقت یہ خیال ایسا ہی غلط اور لغو ہے جیسا کہ یہ کہنا کہ مذہب سے انسانوں میں ایک دوسرے سے نفرت پھیلتی، کشیدگی بڑھتی اور لڑائیاں برپا ہوتی ہیں، انگریز سیاست میں کتنے ہی مستبد اور سخت مزاج ہوں۔ لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ جیسا کہ جون گنتھر (Jhon Ganthr) نے اپنی معرکۃ الآرا کتاب "ان سائڈ افریقہ" (Inside Africa) میں مراکش پر گفتگو کرتے ہوئے لکھا ہے: فرانسیسی استعمار بڑا ظالم اور بے رحم ہوتا ہے وہ اپنی زیر دست قوموں کو اپنی تہذیب میں جذب کر کے ان کی اپنی زبان، کلچر اور تہذیب سے تہی مایہ کر دیتا ہے، لیکن برطانوی استعمار سیاست میں عیاری اور بازیگری کے باوصف مذہب اور تہذیب کے معاملہ میں تنگ حوصلہ اور تنگ نظر نہیں ہوتا۔ اس بنا پر انگریز ایمانداری سے یہ سمجھتے تھے اور صحیح سمجھتے تھے کہ دنیا میں کوئی قوم اپنے ملکی اور قومی معاملات میں اس وقت تک خوا عنادی کے ساتھ دلچسپی نہیں لے سکتی جب تک کہ اس کو اپنے تہذیبی اصول میں آزادی اور استقلال کے ساتھ زندگی بسر کرنے کا موقع نہ ملے، اس کے برخلاف جس قوم کو جبر و تشدد یا حکومت کی شاطرانہ چالوں کے ذریعہ اس کے تہذیبی ورثہ و اثاثہ سے محروم کر دیا جاتا ہے وہ اگرچہ سیاسی مجبوری اور بے بسی کے باعث اس وقت حکومت کو کوئی نقصان نہ پہونچا سکے لیکن

یہ صورت حال دیر پا نہیں ہو سکتی۔ جبر و تشدد کی چٹان کے نیچے محرومی و ناکامی کے احساس کی چنگاریاں اندر ہی اندر سلگتی رہتی ہیں اور آخر ایک وقت آتا ہے جب یہ لاوا پھٹتا ہے تو جبر و تشدد کی چٹان بھک سے اڑ جاتی ہے، یہ ایک فلسفہ نہیں بلکہ تاریخی حقیقت ہے، ابھی اپنے سامنے کی بات ہے، الجزائر کی سرزمین لاکھوں انسانوں کے خون سے رنگین ہوئی تب وہ آزاد ہوا۔ لیکن افریقہ اور ایشیا میں برطانیہ اپنے مستعمرات سے دست بردار ہوا تو اس خوبی اور چابکدستی کے ساتھ کہ دنیا حیران اور انگریزوں کی فراست و تدبر کی قائل ہو گئی۔ علاوہ ازیں یہ بھی فراموش نہ کرنا چاہیے کہ علی گڑھ اور بنارس کی طرح شانتی نکیتن بھی تو آخر ایک تہذیبی یونیورسٹی ہے اور اس یونیورسٹی نے، جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے، نہ صرف قومی سطح پر بلکہ بین الاقوامی سطح پر بھی باہم محبت و رفاقت اور خیر سگالی و خیر اندیشی کے جذبات پیدا کئے ہیں، اکسفورڈ اور کیمبرج کی طرح امریکہ اور یورپ میں بیسیوں یونیورسٹیاں ہیں جو عیسائی تہذیب کی نمائندہ سمجھی جاتی ہیں، لیکن کیا کبھی کسی نے کہا کہ ان سے فرقہ پرستی کو فروغ ہوتا ہے، پھر مسلمانوں کے عہد عروج و ترقی میں غرناطہ، قرطبہ، اشبیلیہ اور الحمراء وغیرہ میں خالص اسلامی یونیورسٹیاں بڑے جاہ و جلال کے ساتھ قائم تھیں، یہود اور نصاریٰ اور دوسرے مذاہب کے طلبار بھی دور دور سے آتے اور ان یونیورسٹیوں میں تعلیم پاتے تھے، لیکن کیا کبھی کسی نے شکایت کی کہ غیر مسلم ہونے کے باعث اس کے ساتھ امتیازی سلوک برتا گیا۔

ہمیں اس سے انکار نہیں کہ بنارس ہندو یونیورسٹی اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ان دونوں اداروں میں تقسیم سے پہلے فرقہ وارانہ سیاست کو پروان چڑھنے اور فروغ پانے کا موقع ملا ہے، لیکن یہ کہنا صحیح نہ ہوگا کہ ان اداروں نے فرقہ وارانہ سیاست کو جنم دیا ہے، بلکہ اصل بات یہ ہے کہ ملک میں سیاست کا رنگ جو کچھ بھی رہا ہے یہ دونوں ادارے اس سے متاثر رہے ہیں اور یہ ایک امر ناگزیر و لابدی تھا، چنانچہ ملک میں تحریک خلافت شروع ہوئی تو جامعہ ملیہ کی شکل میں اس کو لیڈر شپ علی گڑھ سے ملی، پھر تحریک آزادی کے آغاز کا ساتھ

آیا تو جس مرد مجاہد نے ملک میں سب سے پہلے مکمل آزادی کا رزولیوشن پیش کیا اور استعماری آزادی کی تحریک کی سخت مخالفت کی وہ (یعنی مولانا حسرت موہانی) اسی علی گڑھ کی آغوشِ تربیت کا پروردہ تھا، اس کے بعد یہ امر طبعی تھا کہ تحریک پاکستان کا ظہور ہوا تو نواب زادہ لیاقت علی خاں اور نواب محمد اسماعیل دھیو جیسے لیڈر بھی علی گڑھ نے ہی مہیا کئے، اس کا مطلب یہ ہے کہ جہاں تک ہندوستان کے مسلمانوں کا تعلق ہے، علی گڑھ ایک ایسا کارخانہ ہے جہاں ہر قسم کے اوزار اور کل پرزے ڈھلتے ہیں اور بتقاضائے وقت مسلمانوں کو جس قسم کی لیڈرشپ درکار ہوتی ہے اس کا ساز وسامان یہیں سے ہو جاتا ہے۔

مولانا محمد علی رحمۃ اللہ علیہ اس درس گاہ کے نہایت لائق اور قابل فخر فرزند تھے۔ ۲۶ء میں جب وہ وفد خلافت کے ساتھ مکہ مکرمہ تشریف لے جا رہے تھے تو اس موقع پر بمبئی میں ایک نہایت عظیم الشان جلسہ منعقد ہوا۔ میری عمر ۱۸۔۱۹ برس کی تھی۔ دیوبند میں دورۂ حدیث سے فارغ ہو چکا تھا اور اس وقت میں بھی والدۂ مرحومہ کے ساتھ حج کے لئے جا رہا تھا، چنانچہ جہاز اکبری جس سے وفد جمعیۃ العلماء اور وفد خلافت کی روانگی ہوئی اسی سے میں بھی گیا تھا اور بمبئی کے اس جلسہ میں موجود تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ شدھی اور سنگھٹن کی تحریک نے ملک میں فرقہ وارانہ فضا کو نہایت مسموم کر رکھا تھا اور متعدد شدید قسم کے فسادات ہو چکے تھے، اس بنا پر مسلمانوں میں بہت جوش و خروش تھا۔ آج اس واقعہ کو ۴۷ برس ہونے کو ہو گئے، لیکن جلسہ کا کیا سماں تھا! اب بھی آنکھوں میں پھر رہا ہے بالکل کل کی سی بات معلوم ہوتی ہے، عشاء کے بعد کا سہانا وقت، چاندنی رات، ایک طرف سمندر کی موجیں ہیں کہ اچھل کود اور آپس میں چہلیں کر رہی ہیں اور دوسری طرف انسانوں کا بحرِ بے کراں ہے جو ٹھاٹھیں مار رہا ہے، مولانا محمد علی اپنی نورانی شکل و صورت، دیو قامت جسم و جثہ اور عبا و جبہ کے ساتھ اسٹیج پر کھڑے شیر ببر کی طرح گرج رہے ہیں، ہندوستان کی اس وقت کی فرقہ وارانہ کشیدگی اور شدھی سنگھٹن کی تحریک اور اس کے ثمرات کا ذکر آیا تو خود اعتمادی کی دبنگ آواز میں بولے:

ہندو بھائیو! میں نے تو تمھاری طرف ہاتھ بڑھا دیا ہے، اب تمھیں اختیار ہے کہ چاہو تو اس ہاتھ کو وہ ہاتھ سمجھ لو جو ایک دوست دوسرے کی طرف بڑھاتا ہے۔ اگر تم نے ایسا کیا تو تم دیکھو گے کہ ہم سے بڑھکر تمھارا کوئی مخلص اور سچا دوست نہیں ہے، اور اگر تم چاہو تو اس ہاتھ کو وہ ہاتھ سمجھو جو ایک پہلوان دوسرے پہلوان کی طرف بڑھاتا ہے، اگر تم نے ایسا کیا تو تم کو معلوم ہوگا کہ ہم پہلوانی میں بھی پیچھے نہیں ہیں اور ہمیں کشتی لڑنی آتی ہے۔ مولانا کی زبان سے ایک خاص جذباتی انداز میں ان فقروں کا ادا ہونا تھا کہ پورا میدان اللہ اکبر کے فلک شگاف نعروں سے گونج اٹھا[۱]۔

میں نے ان جملوں کو سن کر اس وقت بھی محسوس کیا تھا اور آج بھی محسوس کرتا ہوں کہ یہ دم خم علی گڑھ کے ایک اولڈ بوائے کے ہی ہو سکتے ہیں، آپ اگر چاہیں تو اسے "فرقہ پرستی" کہہ لیجئے۔ لیکن عنوان کے بدلنے سے حقیقتیں نہیں بدلتیں۔ مولانا محمد علی نے جو کچھ فرمایا وہ اسلام کی تعلیم اور اسلامی تہذیب کے خد و خال کے عین مطابق ہے، حبش کے بادشاہ نجاشی نے مکہ کے مسلمان مہاجرین کو پناہ دی اور ان کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آیا تو مسلمانوں نے اس کا بدلہ اس طرح دیا کہ جب اس کے ملک پر حملہ ہوا تو مسلمانوں نے نجاشی کی فوج میں شامل ہو کر شجاعت و سپہ گری کے وہ جوہر دکھائے کہ اہل ملک بھی عش عش کرنے لگے، اور صرف یہی نہیں بلکہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نجاشی کے لئے احسان شناسی کا مظاہرہ اس طرح فرمایا کہ جب اس کا انتقال ہو گیا تو آپ نے اس کے جنازہ کی نماز غائبانہ ادا فرمائی۔

---

۱۔ مجھے یاد ہے، اسی تقریر میں مولانا نے مصر کے لوگوں کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ: لوگو! تمھارے پاس فرعون بھی ہے اور موسیٰ بھی! اب اگر تم کو فرعون پر فخر و ناز ہے تو ہمارا تم سے کوئی تعلق اور کوئی رشتہ نہیں ہے، لیکن اگر تم کو فخر و ناز موسیٰ پر ہے کہ وہ تمھارے ملک میں پیدا ہوئے تھے تو بے شبہ تم ہمارے بھائی ہو۔

یہ تصویر کا ایک رخ ہے، دوسرا رخ یہ ہے کہ ہجرت مدینہ کے بعد بھی مکہ کے کفار نے مسلمانوں کو نقصان اور اذیت پہونچانے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ مدینہ کے یہودیوں سے ساز باز کی، عرب قبائل کو ان کے خلاف اکسایا اور ابھارا تو آخر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی تلوار اٹھائی اور پھر یہ تلوار اس وقت تک نیام میں نہیں گئی جب تک کہ فتح مکہ کی صورت میں ان لوگوں کا قلع قمع نہیں ہو گیا۔ جو لوگ علی گڑھ یونیورسٹی پر فرقہ پرستی کا الزام لگاتے ہیں ان کو اسلامی تہذیب اور اسلام کے نظامِ زندگی کا مطالعہ اس کی اصل اسپرٹ میں کرنا چاہیے اور یہ دیکھنا چاہیے کہ سرسید پر یا علی گڑھ یونیورسٹی پر اگر کبھی کوئی ایسا دور آیا ہے جب کہ وہ آج کل کی اصطلاح میں "فرقہ پرستی" کا شکار ہو گئے ہیں تو اس کے اصل اسباب و دواعی کیا تھے؟ اور اس کی ذمہ داری "البادی اظلم" کے مطابق اولاً و اصلاً کس کے سر عائد ہوتی ہے؟ آپ کہیں گے: ایک چھوٹا سا سوال اور اس کا جواب اس قدر طویل! اس کی وجہ یہ ہے کہ تقسیم کے بعد کے علی گڑھ کو آپ اس وقت تک سمجھ ہی نہیں سکتے جب تک کہ تقسیم سے پہلے کے علی گڑھ کو آپ اچھی طرح نہ سمجھ لیں اور اس سے متعلق اپنے ذہن کو صاف نہ کر لیں۔

---

۱ پروفیسر رشید احمد صدیقی (علی گڑھ تحریک ص ۹) نے بالکل صحیح لکھا ہے: "سرسید نے شروع سے آخر تک تحریر و تقریر سے، برتاؤ سے، کالج کے ذریعہ، ہر جا اور ہمہ وقت ابنائے وطن کو اپنانے کی کوشش کی اور اخلاص و یگانگت کے اظہار میں وہ سب کہتے اور کرتے رہے جس کا عشر عشیر بھی غیر مسلم لیڈروں میں سے کسی نے مسلمانوں کے حق میں غدر سے لے کر گاندھی جی کے وقت تک نہ کیا نہ کہا، ہندوؤں اور ہندوستان سے مسلمانوں کو پورے طور پر وابستہ رکھنے کا عقیدہ سرسید کے دل میں کس قدر راسخ تھا اس کا اندازہ ان کی مشہور تقریروں سے ہوتا ہے۔ اس زمانہ میں اس طرح کی تقریر سرسید کے پایہ کے غیر مسلم لیڈروں نے بھی کی ہوتی تو میرا خیال ہے کہ ہندوستان کی تاریخ اور تقدیر دونوں آج کچھ اور ہوتیں۔"

یہ جو کچھ کہا گیا ہے اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ تقسیم سے پہلے یہاں جو کچھ ہوا اچھا ہوا اور اس میں کوئی برائی یا خرابی نہیں تھی، نہیں! بلکہ اس میں بہت نامناسب اور عاقبت نااندیشی کی باتیں بھی ہوئیں، لیکن آج ہم اپنے برادرانِ وطن سے کہتے ہیں کہ ماضی میں جو کچھ ہو گیا سو ہو گیا اس میں نہ تمہارا دامن پاک ہے اور نہ ہمارا۔ اب آؤ! ہم تم دونوں مل کر عہد کرتے ہیں کہ آئندہ آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ حق اور انصاف کے ساتھ مل جل کر رہیں گے اور کبھی فرقہ پرستی کو ابھرنے نہیں دیں گے، اگر ملک کے ان دونوں بڑے فرقوں میں یہ عہد و پیمان ہو جائے تو دنیا دیکھے گی کہ مسلمان کا قدم اس راہ میں کسی سے پیچھے نہیں بلکہ آگے ہی ہوگا۔ کیونکہ جیسا کہ ابھی سطورِ بالا میں عرض کیا گیا، علی گڑھ جس اسلامی تہذیب کی نمائندگی کرتا ہے اس کا یہی تقاضا اور یہی خصوصیت ہے۔ چنانچہ جو غیر مسلم طلباء اور جو غیر مسلم اساتذہ آج یونیورسٹی میں رہتے ہیں ان سے دریافت کیجئے کہ کیا وہ یہاں اس طرح نہیں رہتے جس طرح وہ اپنے گھروں اور خاندانوں میں رہتے ہیں، کیا ان میں سے کسی کے ساتھ کبھی کوئی امتیازی سلوک برتا گیا ہے؟ کیا وہاں مسلمان طلباء اور اساتذہ ان کی شادی اور غمی میں برابر کے شریک نہیں ہیں، کیا ان کے باہمی تعلقات خوشگوار اور دوستانہ نہیں ہیں؟ مسلمانوں میں یہ وسعتِ قلب، اپنے ساتھی اور پڑوسی کا یہ خیال، اس کا احترام اور اس کی دلجوئی اور مدارات! یہ سب دین ہے اس تہذیب کی جس کا علمبردار علی گڑھ ہمیشہ سے رہا ہے اور آج بھی ہے۔

**یونیورسٹی کے ۲۷ برس**

بہرحال ۱۹۲۰ء میں یہ یونیورسٹی عالمِ وجود میں آئی اور اس طرح ملک کی تقسیم اور آزادی کے حصول تک اس نے اپنی زندگی کے ستائیس برس گذارے تھے، اس زمانہ میں وائس چانسلر کا ابتدائی تقرر تین برس کے لئے ہوتا تھا اور اس کا انتخاب دوبارہ ہو سکتا تھا، لیکن علی گڑھ چونکہ صرف ایک تعلیم گاہ نہیں بلکہ ایک تحریک تھا اور یہاں جو کچھ ہوتا تھا اس کی صدائے بازگشت پورے ملک میں سنی جاتی تھی اس بنا پر

اس یونیورسٹی کا وائس چانسلر ہوتا تھا ملک میں اس کا بڑا وقار اور بھرم ہوتا تھا اس لئے اس عہدہ کے لئے جس شخص کا بھی انتخاب ہوتا تھا اس کی شخصیت، علم وعمل اور کیرکٹر کے لحاظ سے نہ صرف مسلمانوں میں، بلکہ گورنمنٹ کے ہاں بھی بہت نمایاں ہوتی تھی۔ چنانچہ راجہ محمود آباد، صاحبزادہ آفتاب احمد خاں، سر راس مسعود، ڈاکٹر سر ضیاء الدین، سر شاہ محمد سلیمان، نواب سر مزمل اللہ خاں اور نواب محمد اسماعیل خاں، جو اس دور میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے آگے پیچھے (یہ نام غیر مرتب ہیں) وائس چانسلر ہوئے۔ یہ سب نہایت عظیم شخصیت کے اور ملت اسلامیہ ہند کے مایۂ نازش فرزند تھے، ایک طرف ان کی قابلیت اور علم وفضل کا یہ عالم تھا کہ جس مجلس میں ہوتے میر مجلس ہو کر رہتے، سر راس مسعود کو جن لوگوں نے دیکھا ہے ان کا بیان ہے کہ انگریزی اور فرانسیسی اہل زبان کی طرح بولتے، ہر موضوع پر بے تکلف اور برجستہ فصیح وبلیغ تقریر کرتے۔ انگریزی، فرانسیسی، فارسی اور اردو کے ہزاروں اشعار برنوکِ زبان تھے۔ جستہ جستہ ان کو پڑھتے، ان کی تشریح کر کے ان کا حسن وقبح بیان کرتے تو سامعین پر وجد کی کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔ ڈاکٹر ضیاء الدین ریاضیات میں اور سر شاہ محمد سلیمان سائنس میں بین الاقوامی شہرت رکھتے تھے اور دوسری جانب بڑے پکے اور سچے مسلمان تھے، نماز روزہ کے پابند اور اسلامی شعائر وروایات کے دلدادہ تھے۔ صاحبزادہ آفتاب احمد خاں پنجوقتہ نماز باجماعت مسجد میں ادا کرتے اور معتبر لوگوں کا بیان ہے کہ تہجد کی نماز تک کے پابند تھے۔ ان حضرات کا کردار، کیرکٹر اور بے نفسی کا یہ عالم تھا کہ سر شاہ سلیمان دہلی سے جہاں وہ ہائیکورٹ کے جج تھے، ہر ہفتہ علی گڑھ آتے تھے تو آمد ورفت کا کرایہ اور علی گڑھ میں قیام کے زمانہ میں کھانے پینے کا خرچ بھی خود برداشت کرتے تھے اور اپنی ذات کے لئے یونیورسٹی سے ایک پیسہ تک لینے کے روادار نہیں تھے، سر شاہ سلیمان کو ہم نے بھی دیکھا ہے اور ان کی صحبت میں بیٹھنے کا بھی اتفاق ہوا ہے، اللہ اکبر! کیا عجیب وغریب شخصیت تھی، ہر شخص بھی ان کے پاس بیٹھتا ان کی طرف غیر معمولی کشش محسوس کرتا تھا۔ مجھے ذاتی طور

پر ان گے اور ان کے گھر کے بعض ایسے واقعات معلوم ہیں جن کے باعث میرا خیال ہے کہ اخلاق اور روحانی و باطنی اوصاف و کمالات کے اعتبار سے ان کے خدا رسیدہ ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہے، راجہ محمود آباد، نواب سر مزمل اللہ خاں اور نواب محمد اسماعیل خاں اسلامی شعائر و اخلاق اور اسلامی تہذیب کے اقدار عالیہ کے حامل اور صحیح معنی میں اس کے نمائندہ تھے۔ ان حضرات کے شب و روز مسلمانوں کی فلاح و بہبود اور ان کی مخلصانہ خدمت کے لئے وقف تھے اور اس لئے یہ حضرات قوم پر فدا تھے اور قوم ان پر فدا تھی۔

اب اس عہد کے چانسلروں کو دیکھئے تو آپ کو اس فہرست میں سلطان جہاں بیگم والیۂ بھوپال، نواب محمد حمید اللہ خاں، (بھوپال) میر عثمان علی خاں نظام حیدر آباد دکن، کے نام نظر آئیں گے اور اس سے اندازہ ہوگا کہ اس یونیورسٹی کو کس طرح ہندوستان کی نامور اور بلند پایہ ریاستوں کی سرپرستی حاصل تھی، یہ ریاستیں گراں قدر مالی امداد بھی دیتی تھیں اور اس کے تمام تعلیمی، انتظامی اور تہذیبی امور میں دلچسپی لیتی تھیں، نواب حمید اللہ خاں نے تو تعلیم بھی یہیں پائی تھی۔

تقسیم سے پہلے کے اس مختصر دور میں یونیورسٹی کو متعدد مرتبہ سخت اور صبر آزما حالات سے سابقہ پڑا، اس قسم کا پہلا حادثہ تو اس وقت پیش آیا جب کہ یونیورسٹی ابھی عالم وجود میں آئی ہی تھی، ترک موالات کی تحریک شباب پر تھی اس کا حملہ یونیورسٹی پر بھی ہوا، حملہ اس اس قدر شدید تھا کہ اس کے در و دیوار ہل گئے، لیکن "عدو شرے برانگیزد کہ خیر ما دراں باشد" کے مطابق اس حملہ کے بطن سے جامعہ ملیہ اسلامیہ پیدا ہوئی اور اس طرح اب ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے تعلیم جدید کی دو درس گاہیں ہوگئیں، اس کے بعد یونیورسٹی کو دوسرا حادثہ سر رحمت اللہ کمیشن کی صورت میں پیش آیا، یہ حادثہ بھی اس درجہ شدید تھا کہ یونیورسٹی کا انتظام درہم برہم ہوگیا، بہت سے پرانے لوگوں کو یہاں سے جانا پڑا اور نئے لوگوں نے ان کی خالی جگہوں کو پر کیا، اس کے بعد تیسرا حادثہ اس وقت پیش آیا جب کہ تحریک پاکستان کے

نیا اثر یونیورسٹی عملاً تحریک کے سپاہیوں کا ایک کیمپ بنکر رہ گئی، یہ حوادث یونیورسٹی کے لئے خواہ کتنے ہی صبر آزما اور شدید ہوں، لیکن نئے نہیں تھے، اس قسم کے حالات و واقعات ہر یونیورسٹی میں ہی پیش آتے رہتے ہیں، لیکن یہ ہمیشہ وقتی اور ہنگامی ہوتے ہیں اور ان کے اسباب و محرکات اندرونی اور داخلی کم، زیادہ تر بیرونی اور خارجی ہوتے ہیں، ان کی قدریں عارضی اور ہنگامی و وقتی ہوتی ہیں، مستقل اور پائدار نہیں ہوتیں۔ اور عقل سلیم کا تقاضا ہے کہ ان کو اسی روشنی میں دیکھا اور جانچا جائے۔

بہرحال یونیورسٹی اپنی تہذیبی روایات کے ساتھ بڑھتی اور ترقی کرتی رہی، اس میں کوئی شبہ نہیں کہ سرسید نے ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ کے بعد اس درس گاہ کے ذریعہ مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ ( Renaissance ) کا جو خواب دیکھا تھا وہ پورا ہوا۔ جیسا کہ عرض کیا گیا، علی گڑھ صرف ایک کالج نہیں، بلکہ ایک تحریک تھا ــــ اور تحریک بھی بڑی موثر اور فعال ــــ اس تحریک نے مسلمانوں کے عروق مردہ میں زندہ رہنے کے ارمان کا نیا اور تازہ خون پیدا کیا۔ جو لوگ مایوسی اور ناکامی کے شدید احساس کے باعث ہمت کا ساتھ چھوڑ بیٹھے تھے وہ عزم و ہمت اور خود اعتمادی کے ساتھ چلنے کے قابل ہو گئے، اس تحریک نے ان کو حوصلہ دیا، ولولہ کار دیا، جوش عمل بخشا اور تنازع للبقا کے میدان میں اپنے لئے ایک مقام حاصل کر لینے کا سلیقہ سکھایا، اس تحریک کا یہ اثر تھا کہ مسلمانوں نے علوم و فنون، ادب اور لٹریچر، طب اور قانون، اڈمنسٹریشن، صنعت و حرفت، زراعت و فلاحت، جرنلزم اور تعلیم، غرض کہ ہر شعبہ زندگی میں ترقی کی، حکومت کا کوئی محکمہ ایسا نہیں تھا جس میں انھوں نے حسن کارگزاری کا نقش نہ بٹھایا ہو، اسی طرح پبلک لائف کی کوئی شاخ ایسی نہ تھی جس پر ان کی شہرت اور منزلت کا طوطی نہ بولا ہو، اس تحریک کی افادیت اس ملک تک ہی محدود نہ رہی، بلکہ دور دور تک پہونچی اور یہ یونیورسٹی صرف ہندوستان کی نہیں، بلکہ ایشیا کی ایک عظیم یونیورسٹی بن گئی۔

آپ کو یاد ہوگا، سر آغا خاں نے یونیورسٹی تحریک کی قیادت کرتے ہوئے ایک مرتبہ کہا تھا کہ یہ یونیورسٹی مسلمانوں میں روحانی اتحاد کا ذریعہ ہوگی، موصوف کا یہ خیال اس طرح صحیح ثابت ہوا کہ اس یونیورسٹی کے سرچشمۂ فیض سے جو ہزاروں مسلمان سیراب ہوچکے ہیں ان میں کتنے ہی سنی ہوں گے اور کتنے شیعہ، ان میں دیوبندی بھی ہوں گے اور بریلوی بھی، مقلد بھی ہوں گے اور غیر مقلد بھی، لیکن یہ سب علی گڑھ آئے۔ برسوں کلاس روم اور ہوسٹل میں، کھیل کے میدانوں اور یونین کے جلسوں میں ایک ساتھ مل جل کر اور ایک دوسرے کے ہمدرد و غم گسار بن کر زندگی بسر کی اس بنا پر ان میں باہم محبت اور ربط و ضبط ایسا ہی ہے جیسا کہ ایک ہی ماں اور باپ کی اولاد میں باوجود افکار و خیالات میں اختلاف کے ہوتا ہے۔ آج آپ دنیا کے کسی گوشہ میں چلے جائیے۔ علی گڑھ کا پرانا تعلیم یافتہ اگر وہاں کوئی آپ کو ملے گا اور اسے یہ معلوم ہوگا کہ آپ کا تعلق بھی علی گڑھ سے ہے تو وہ آپ سے اس طرح ملے گا کہ گویا اپنے بھائی سے مل رہا ہے، اس بنا پر یہ یونیورسٹی آج اسلامی اخوت و برادری کی ایک رمز یہ علامت (Symbol) بھی ہے۔

چنانچہ ابھی میں جنوبی افریقہ اور مورشیس کے سفر سے واپس آیا ہوں۔ ان دونوں ملکوں میں علی گڑھ کے تعلیم یافتہ کثرت سے ہیں، جگہ جگہ یہ حضرات ملتے تھے تو علی گڑھ کی خیریت اس ذوق و شوق سے دریافت کرتے تھے جیسے بڑھاپے میں بچپن کے کسی عزیز ترین دوست کا شناسا آپ کو مل جائے تو آپ کرید کرید کر اس کا حال دریافت کرتے ہیں۔


## گذارش

خریداری برہان یا ندوۃ المصنفین کی ممبری کے سلسلہ میں خط و کتابت کرتے وقت یا منی آرڈر کوپن پر برہان کی چٹ کے نمبر کا حوالہ دینا نہ بھولیں تاکہ تعمیل ارشاد میں تاخیر نہ ہو۔ (منیجر)